# خلیفہ عبدالحکیم مرحوم

## خواجہ بدر

خلیفہ عبد الحکیم لاہور کے ایک کشمیری متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے ۔ ان کے دادا ہزاروں دوسرے کشمیری مہاجرین کی طرح کشمیر کے بے رحم حکمرانوں کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر لاہور میں آ بسے تھے اور پھر یہیں کے ہو رہے ۔ اگر دولت و ثروت کے لحاظ سے وہ نمایاں حیثیت کے مالک نہ تھے لیکن وجاہت و عزت کے لحاظ سے اس خاندان کو اپنے علاقے میں نمایاں جگہ حاصل تھی ۔ ان کے دادا ایک چھوٹے کارخانے کے مالک تھے جس میں چند کاریگر کام کرتے تھے اور اسی بنا پر ان کو خلیفہ کا لقب ملا جس سے ڈاکٹر عبد الحکیم بعد میں معروف ہوئے ۔

خلیفہ صاحب کی پیدائش ۱۱ جولائی سنہ ۱۸۹۴ کو لاہور ہی میں ہوئی اور یہیں انہوں نے انجمن حمایت اسلام کے مشہور اور قدیم اسلامیہ ہائی اسکول شیرانوالہ دروازے میں تعلیم حاصل کی ۔ ان دنوں پنجاب میں سرسید کی تعلیمی تحریک سے بڑی دلچسپی اور وارفتگی پائی جاتی تھی اور اس زمانے کے اکثر بزرگ اپنی اولاد کو علیگڑھ میں تعلیم دلوانے کی تمنا کیا کرتے تھے۔ چنانچہ خلیفہ صاحب بھی علیگڑھ تعلیم پانے گئے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ خاص وجوہ کے باعث وہاں کی زندگی انہیں راس نہ آئی اور وہ بہت جلد دہلی کے سینٹ سٹیفن کالج میں داخل ہو گئے جہاں سے سنہ ۱۹۱۵ء میں انہوں نے بی ۔ اے آنرز اور سنہ ۱۹۱۷ء میں ایم۔ اے (فلسفہ) پاس کیا۔ ان دونوں امتحانوں میں انہوں نے نمایاں حیثیت حاصل کی۔ ایم۔ اے کے امتحان میں انہوں نے رومی پر ایک مقالہ لکھا جو آج تک پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے ۔ ۱۹۱۹ میں اقبال کی سفارش پر خلیفہ عبد الحکیم کا تقرر حیدر آباد کی عثمانیہ یونیورسٹی میں ہو گیا اور وہیں انہوں نے اپنی عمر کا بہترین حصہ بسر کیا۔ ۱۹۲۲ میں وہ ہائیڈل برگ یونیورسٹی (جرمنی) گئے جہاں سے انہوں نے فلسفہ میں ڈی فل کی ڈگری لی ۔ ان کا مقالہ ”رومی کی ما بعد الطبیعیات“ بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوا جس کے کوئی تین مختلف ایڈیشن نکل چکے ہیں ۔

چالیس سال سے کچھ اوپر انہوں نے حیدر آباد کے علمی ماحول میں بسر کئے ۔ وہ اپنی گفتگو میں اس زندگی کے متعلق باتیں کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس جگہ کے ماحول سے کافی حد تک مطمئن تھے ۔ وہ اکثر

وحیدالدین سلیم پانی پتی مرحوم کے منجھے ہوئے ادبی ذوق کا ذکر کیا کرتے تھے ۔ تقلید اور اجتہاد پر بحث کرتے ہوئے وہ اکثر وحید الدین سلیم مرحوم کا نام لیتے ۔ جامعہ عثمانیہ کی مجلس وضع اصطلاحات میں کئی بزرگ ہوتے تھے ۔ کسی انگریزی اصطلاح کے اردو مترادف کی تلاش ہوتی ۔ وحید الدین سلیم مرحوم انگریزی دانوں سے اس لفظ کے لاطینی یا یونانی مادوں کے معنی دریافت کرتے اور پھر ایک عمدہ اردو اصطلاح ، بالکل نئی ' تیار کر کے پیش کردیتے۔ اس پر تقلید کے پرستار سند کے طالب ہوتے تو وحید الدین سلیم فوراً ایک شعر کسی استاد کے نام سے پیش کر دیتے ۔ وہ شعر بالکل جعلی ہوتا تھا لیکن کسی استاد کے نام سے منسوب ہونے سے اسے سند کی حیثیت حاصل ہوتی اور وہ اصطلاح تسلیم کر لی جاتی ۔ اسناد پرستی کی بات سے ایک دوسرا واقعہ یاد آیا جو خلیفہ صاحب اکثر سنایا کرتے تھے ۔ دیوبند کے ایک بزرگ استاد چھوٹے قد کے تھے اور ان کے پڑھاتے وقت طلباء کچھ تکلیف محسوس کرتے۔ بعض نے مشورہ دیا کہ آپ ایک اونچی مسند بچھا لیں تاکہ طلباء کو آپ کی طرف متوجہ ہونے میں آسانی ہو۔ لیکن سوال وہی سند کا تھا۔ کیا ایسی مسند بچھا کر درس دینا کبھی اسلاف کا معمول رہا ہے ؟ آخر حضرت امام مالک کی زندگی میں ایسی مسند کا ذکر ملا اور اس سند کے ہوتے ہوئے مسند کا استعمال شروع ہوا۔ خلیفہ صاحب اکثر مسلمانوں کی اس متشدد اسناد پسندی کے خلاف آواز بلند کیا کرتے تھے ۔

خلیفہ صاحب کی زندگی میں تصوف سے ذوق بہت گہرا تھا ۔ اگرچہ وہ علمی طور پر اس کے قائل تھے کہ اسلامی تصوف کی تعمیر میں قبل از اسلام تحریکوں کا بڑا اثر ہے پھر بھی وہ تصوف کی اسلامی روح سے بڑے متاثر تھے ۔ میرا خیال ہے کہ ان کی زندگی کے اس رخ کی تعمیر میں وحید الدین سلیم مرحوم کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور تھا ۔ سنایا کرتے تھے کہ وحید الدین کی بیوہ والدہ حضرت غوث علی شاہ قلندر پانی پتی کی خدمت کیا کرتی تھیں اور خود وحید الدین سلیم نے اپنی ابتدائی زندگی اس قلندرانہ ماحول میں گزاری ۔ حضرت غوث علی شاہ قلندر کی زندگی کے بہت سے واقعات خلیفہ صاحب نے ان ہی کی زبان سے سنے تھے اور اس طرح کے چشم دید واقعات سے انکار ذرا مشکل ہوتا ہے ۔ کئی غیر معمولی واقعات کے بیان کرنے کے بعد وہ اکثر تصوف اور روحانیات کی دنیا میں گم ہو جایا کرتے تھے اور پورے وثوق سے اس مادی دنیا سے ماوریٰ ایک روحانی نظام کائنات کے وجود کے متعلق اثباتی رنگ میں بے شمار دلائل اور واقعات و مشاہدات کا انبار لگا دیتے ۔

حیدر آباد کی زندگی سے متعلق جس دوسرے شخص کی تعریف ان کی زبان سے سنی وہ بہادر یار جنگ مرحوم تھے ۔ خلیفہ صاحب ان کے عزم و حوصلہ ،

خلوص و قلندرانہ صفات کے بہت مداح تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب بھی حیدرآباد کی زندگی کا ذکر ہوا ایک طرف وحید الدین سلیم اور دوسری طرف بہادر یار جنگ کا نام ان کی زبان پر ضرور آتا ۔

نظام حیدرآباد کے متعلق ان کی زبان سے کبھی کوئی کلمہ' خیر کم از کم میں نے نہیں سنا ۔ وہ ہمیشہ ان کی خسیس عادات اور گندی طبیعت کا ذکر کرتے ۔ انہوں نے اپنی زندگی کا بہترین دور حیدر آباد میں بسر کیا لیکن وہ ہمیشہ سیاست اور دربار داری کی زندگی سے الگ تھلگ رہے ۔ علمی زندگی ان کی طبیعت کو ایسی راس آئی کہ پاکستان آنے کے بعد انہیں کئی بار سفارت اور وزارت کے عہدے پیش ہوئے لیکن انہوں نے اس ظاہری شان و شوکت کے مقابلے پر علمی زندگی کی گوشہ نشینی اور عزلت گزینی کو ہمیشہ ترجیح دی ۔ یہاں تک کہ جب سردار نشتر مرحوم پنجاب کے گورنر تھے تو انہوں نے خلیفہ صاحب کو کئی بار پنجاب یونیورسٹی کی وائس چانسلری پیش کی لیکن انہوں نے ہر بار اپنی نا اہلیت کا عذر پیش کیا اور اپنے آپ کو اس سیاسی کشمکش کی زندگی سے بچائے رکھا ۔ اس برعظیم کے کئی مسلمان راہنما جو اپنی قوم کے لئے گوہر گرانمایہ ثابت ہو سکتے تھے سیاست میں شامل ہونے کے باعث ملت کی صحیح خدمت سے محروم رہے اور قوم ان کے علمی فیض اور تمدنی ثروت سے بے بہرہ رہی ۔

خلیفہ صاحب کی معلمانہ زندگی کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ درس و تدریس کے مروجہ طریقے کے بالکل پابند نہیں تھے ۔ انہوں نے ہمیشہ جماعت میں طلبا کے سامنے فلسفیانہ مسائل و مباحث کو اس طرح پیش کیا گویا ایک نجی محفل ہے جس میں تبادلہ' خیالات ہو رہا ہے ۔ وہ اپنے مضمون کے بیان کرنے میں مگن ہیں اور طلبا ان کے بیانات کو سننے میں گم ، کسی کو پتہ نہیں کہ گھنٹہ ختم ہو گیا ہے یا ابھی جاری ہے ۔ اگرچہ مجھے ان کی شاگردی کا فخر حاصل نہیں لیکن خلیفہ صاحب اکثر ان باتوں کا اشارے کنائے سے ذکر کیا کرتے تھے اور اس کی تصدیق ان کے شاگردوں کی زبان سے ہوئی ۔ یہ طریقہ' گفتگو ان کی امتیازی شان تھی ۔

ہر محفل میں گرم گفتگو ہوتے اور ہر قسم کے مسائل پر اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتے کہ سننے والوں پر ضرور اثر ہوتا ۔ فارسی اور اردو شاعری سے ذوق ان کو طالب علمی کے زمانے سے تھا۔ چنانچہ بھگوت گیتا کے منظوم اردو ترجمے کے دیباچہ میں انہوں نے ذکر کیا ہے کہ اس دور میں انہوں نے شعر کہنا شروع کر دیا تھا اور فیضی کے فارسی ترجمے کا غور سے مطالعہ کیا تھا جس کے اکثر برجستہ اشعار ان کے لوح ذہن پر ثبت ہو گئے ۔ اس ادبی ذوق کی جھلک ان کی گفتگو میں خاص طرح پر نمایاں تھی۔ فلسفہ ہو یا نفسیات ، مذہبی

مباحث ہوں یا معاشرتی مسائل ، ہر جگہ ان کے بیان میں شعر و شاعری کے حوالے اور مشکل اشعار کی تشریح موجود ہوتی ۔ مجھے پانچ چھ سال مسلسل ان کی صحبت میں بسر کرنے کا فخر حاصل ہے۔ وہ ہر روز کم از کم دو گھنٹے مجلس میں بیٹھتے جہاں ہر شخص کو بیٹھنے اور بات میں حصہ لینے کی اجازت ہوتی ۔ ہر روز نئے مباحث پر گفتگو ہوتی اور ہر بار بلا مبالغہ وہ نئے زاویوں سے مسائل پر بحث کرتے۔ سنجیدہ مسائل کے علاوہ وہ لطائف و ظرائف کا خزینہ تھے ۔ میں نے ان کی زبان سے ہزاروں لطائف سنے ہوں گے لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی دن انہوں نے کوئی پرانا لطیفہ دہرایا ہو ۔ شعر فہمی کا ملکہ رکھتے تھے اور ادق سے ادق فلسفیانہ بحث کو اشعار کی مدد سے حل کرنے میں بے مثال تھے ۔ میں نے ان کی مجلس میں بڑے بڑے سیاسی راہنما ، بلند مرتبہ سرکاری عہدہ دار اور علماء و فضلا کو ان کی دلپذیر گفتگو ، ان کے دل کش طرز بیان اور ان کی شگفتہ بذلہ سنجیوں سے ہمیشہ متاثر پایا ۔

حیدر آباد کی تعلیمی زندگی کے آخری دور میں آپ عارضی طور پر کشمیر چلے گئے اور وہاں کچھ عرصہ ڈائریکٹر تعلیمات بھی رہے ۔ کشمیر ان کا آبائی وطن تھا ، چنانچہ یہاں کی چند سالہ زندگی کی یاد ان کے ذہن سے کبھی محو نہیں ہوئی ۔ وہ اکثر اس دور کے واقعات کا ذکر بڑی دلچسپی اور عقیدت ، شیفتگی اور افسردگی سے کیا کرتے تھے ۔ کشمیر کے قیام کے دنوں میں ان کے مراسم شیخ عبد اللہ سے بہت گہرے ہو گئے تھے ۔ چنانچہ ۱۹۴۷ کے ہنگامہ خیز دور میں انہوں نے کچھ سیاسی قسم کی پیام رسانی بھی کی ۔ کبھی کبھی نجی محفلوں میں ان سیاسی باتوں کی طرف اشارہ کیا کرتے تھے ۔ ہم نے خواہش کی کہ وہ اس سیاسی پیام رسانی کے متعلق اپنی معلومات کو قلمبند کروا دیں تو بہت اچھا ہو گا ۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ کام شروع نہ کیا جا سکا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر کی چند سالہ زندگی نے ان کے قلب و ذہن کو اتنا موہ لیا تھا کہ انہوں نے نسیم باغ میں ایک عمدہ مکان تعمیر کروایا اور اپنی تمام عمر کا سرمایہ کتابیں یہیں لے آئے ۔ ان کا ارادہ تھا کہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد کی خدمت سے سبکدوشی کے بعد یہاں اطمینان سے بیٹھ کر اپنی بقایا زندگی علم و حکمت کی خدمت میں خاموشی سے بسر کریں مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا ۔ ۱۹۴۷ سے کشمیر کے حالات دگرگوں ہوتے چلے گئے۔ فسادات اور افراتفری سے خلیفہ صاحب کے علمی ذخیرہ کو بھی نقصان پہنچا ۔ چنانچہ وہاں کی سکونت کا ارادہ ترک کر کے انکو لاہور آنا پڑا۔ کشمیر کے حالات اور اس جبری نقل مکانی کا انہیں بڑا قلق رہا ۔ مگر جس چیز کا انہیں سب سے زیادہ صدمہ تھا وہ کتابوں کے اس ذخیرے کا نقصان تھا جو انہوں نے ربع صدی کے دوران جمع کیا تھا۔ لیکن لاہور میں ان کا ورود کئی حیثیتوں سے فائدہ مند ثابت ہوا۔

لاہور اس برصغیر کا ایک اہم ثقافتی مرکز رہا ہے اور پاکستان بننے کے بعد اس کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ ایسی مرکزی جگہ میں خلیفہ صاحب کو اپنے مقاصد کی تکمیل میں کہیں زیادہ سہولتیں میسر آ سکتی تھیں ۔ چنانچہ چند سالوں کے بعد ۱۹۵۰ء میں خلیفہ صاحب نے حکومت پاکستان کی مدد سے ادارہ ثقافت اسلامیہ کی بنا ڈالی ۔ اس ادارے کے قیام کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اسلام کی ابدی تعلیمات اور مسلمانوں کے ثقافتی اور علمی کارناموں کو جدید زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں اور علمی معیار کے مطابق پیش کیا جائے ۔ ایک طرف مغرب کے غلط علمی نظریات سے مادہ پرستانہ رجحانات پیدا ہو چکے تھے جو انسانی زندگی کی اخلاقی اور روحانی اقدار کے منافی تھے اور جنکے باعث ہماری نئی نسل کی زندگی ایک خطرناک بحران سے دو چار تھی ۔ دوسری طرف دین کی وہ قدیم تفسیر و تعبیر تھی جس کی بنیاد اگرچہ خلوص و دیانتداری پر مبنی تھی تاہم جدید حالات سے ناواقفیت کی بنا پر نہ صرف اپنی افادیت کافی حد تک کھو چکی تھی بلکہ اپنی غیر معقول ماضی پرستی کے باعث مادہ پرستانہ رجحانات کو بالواسطہ تقویت پہنچا رہی تھی ۔ جدید حالات کے نئے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے دین کی ایسی تعبیر کی ضرورت تھی جو اسلام کے تمام اساسی تصورات پر ایمان رکھتے ہوئے زندگی کی بدلتی ہوئی ضروریات اور زمانی و مکانی تقاضوں کو پورا کر سکے ۔ خلیفہ عبدالحکیم نے اس عظیم الشان اور اہم کام کی ذمہ داری قبول کر کے پاکستان کے مسلمانوں کی ایک بڑے نازک دور میں بڑی خدمت کی۔ غلطیوں سے کون انسان مبرا ہے ؟ جن اسلاف کے کارناموں پر ہم آج فخر کرتے ہیں ان میں سے کسی کے متعلق بھی ہمارا یہ عقیدہ نہیں کہ انہوں نے حقیقت کو مکمل اور اکمل صورت میں پا لیا اور پیش کیا۔ کہیں کسی وجہ سے انسان کے کام میں نقص رہ جاتا ہے ۔ تمام خوبیوں اور سچائیوں کی جامع ذات تو خدائے تعالیٰ ہی ہے۔ انسان کی ذمہ داری خلوص اور جد و جہد سے سچائی کو سمجھنے اور اسے پیش کرنے کی ہے اور اس معاملے میں خلیفہ عبدالحکیم نے اپنی طرف سے بڑی کامیاب کوشش کی ہے ۔ ان کی کتاب ’’ اسلام کا نظریۂ حیات ‘‘ جو ادارہ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے شائع ہوئی اسکا بین ثبوت ہے۔ اس میں انہوں نے اپنی روایتی سادہ بیانی سے اسلام کے عقائد کو واضح اور جدید شکل میں پیش کیا۔ اگرچہ ساری عمر انہوں نے فلسفہ کے مسائل پر غور و خوض کرنے اور اس کی تعلیم دینے میں صرف کی ، لیکن ان کی تحریروں میں کبھی روایتی فلسفیانہ گنجلک کا گذر نہیں ہوتا ۔ وہ مشکل سے مشکل مسئلے کو سادہ اور دلنشین انداز میں بیان کرنے پر پوری طرح قادر تھے چنانچہ ان کی یہ کتاب افکار کی گہرائی کے ساتھ ساتھ سادہ بیانی کی بہترین مثال ہے ۔

یوں تو ان کو فارسی اور اردو شعراء کے ہزاروں اشعار زبانی یاد تھے جو

خلیفه عبدالحکیم ( پاکستان )　　　　شیخ محمد بہجت البیطار (شام)

یه تصویر امریکه میں لی گئی جب وہ امریکه اور کینیڈا کے دورے پر گئے تھے -

( صفحه ۲۰ )

خلیفہ عبد الحکیم احرام میں

(صفحہ ۲۱)

حج کے موقعہ پر ایک تصویر

©2002-2006 All rights reserved

گفتگو کے دوران میں بر محل استعمال کیا کرتے تھے لیکن حافظ شیرازی سے ان کا لگاؤ ایک عجیب نوعیت کا تھا۔ اس برعظیم میں سب سے پہلے حالی نے اور پھر اقبال نے حافظ کے فلسفہ٭ حیات پر بھرپور تنقید کی تھی - حالی کی تنقید تو شاید محض محدود حلقوں سے باہر راہ نہ پا سکی لیکن اقبال کی تنقید نے تو کافی شوروغوغا پیدا کیا یہاں تک کہ حسن نظامی اور اکبر الہ آبادی جیسے بزرگ بھی اقبال سے نالاں نظر آنے لگے۔ اقبال کی عظمت فکر کو تسلیم کرنے کے باوجود کافی لوگ ایسے موجود ہیں جو حافظ کی تنقیص کو غلط سمجھتے ہیں۔ ان میں خلیفہ صاحب بھی تھے ۔ وہ حافظ کو صحیح معنوں میں لسان الغیب سمجھتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ ان کو حافظ کی روح سے ایک عجیب و غریب گہرا رشتہ ہے اور زندگی کے ہر نازک موقعے پر انہوں نے حافظ کی روح کی طرف رجوع کیا اور بقول ان کے حافظ نے انہیں کبھی مایوس نہیں کیا ۔ وہ دو چار دس نہیں بلکہ سینکڑوں واقعات اپنی زندگی کے مختلف ادوار سے سنایا کرتے تھے جب وہ کوئی اہم فیصلہ کرنے سے پہلے دیوان حافظ کی طرف رجوع کیا کرتے اور جو کچھ فیصلہ وہاں پاتے اسی کے مطابق عمل کیا کرتے تھے ۔ان کا کہنا ہے کہ انہیں کبھی اس طرح کی ہدایت سے مایوسی نہیں ہوئی اور ناکامی کا کبھی منہ دیکھنا نہیں پڑا ۔ حافظ کا لسان الغیب ہونا ان کے خیال میں روحانی عالم کے وجود کا ایک ناقابل تردید ثبوت تھا ۔ لیکن اس روحانی یگانگت کے باوجود خلیفہ صاحب کا فلسفہ٭ حیات حافظ کے تصورات سے یقیناً مختلف تھا ۔ خلیفہ صاحب کی تحریر ، ان کی گفتگو اور خود ان کی زندگی رجائیت سے بھرپور تھی ۔ اس میں حافظ جیسی قنوطیت کا کہیں گذر نہ تھا ۔ وہ عمل کے قائل تھے اور حافظ کے پیش کردہ جبر کے سخت مخالف تھے ۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ہم عجیب دور میں پیدا ہوئے ، ایک طرف مسلمانوں کا ماضی ہے جو نہایت شاندار علمی کارناموں سے لبریز ہے اور دوسری طرف مستقبل ہے جب مسلمان دوبارہ دنیا کی علمی امامت پر سرفراز ہونے والے ہیں ۔ لیکن افسوس ہے تو یہ کہ ہم اس درمیانی دور میں پیدا ہوئے جب ہر جگہ تاریکی ہی تاریکی ہے ۔ انہیں اسلام اور پیغمبر اسلام سے گہرا جذباتی لگاؤ تھا ۔ وہ پکے مسلمان تھے اور مسیحی مستشرقین کے اسلام کے خلاف حملوں پر کچھ اس طرح سیخ پا ہوتے کہ ان کا مقابلہ مشکل ہو جاتا ۔ جب کوئی یورپین یا امریکی عیسائی ان سے گفتگو شروع کرتا تو بجائے اس کے کہ وہ اسلام پر گفتگو کرتے ہوئے مختلف پہلوؤں پر اعتراضات شروع کرتا ، خلیفہ صاحب عیسائیت کے چند مشہور مسائل پر بحث شروع کر دیتے اور یورپ اور امریکہ میں عیسائیت کے بے شمار فرقوں کی باہمی کشمکش اور تصادم کا تفصیلی تذکرہ لے بیٹھتے ۔ چونکہ یہ تمام باتیں ان کے اپنے ذاتی مشاہدات کا نتیجہ تھیں اس لئے مخالف کو سوائے خاموش رہنے کے اور کوئی

چارہ کار نہ رہتا ۔ ایک دفعہ ایک ترکی وفد ملاقات کے لئے آیا ۔ باتوں باتوں میں انہوں نے سیکولرازم اور قرآن حکیم کے قانون وراثت کے خلاف لڑکوں اور لڑکیوں کے مساوی حقوق وراثت کی تائید شروع کر دی ۔ بس پھر کیا تھا۔ خلیفہ صاحب کے لئے اسلام پر یہ حملہ اور وہ بھی ایک مسلمان کی زبان سے ، ناقابل برداشت تھا ۔ صوفے پر بیٹھے ہوئے انہوں نے رخ بدلا ، سگریٹ کو خاکدان میں رکھ دیا اور گفتگو شروع کی ۔ دلائل کا انبار لگا دیا ۔ ان کے چہرے پر جلال تھا ، زبان میں روانی اور کاٹ اور گفتگو تھی کہ ایک بہتے ہوئے دریا کی طرح رواں تھی ۔ حریف تاب نہ لا سکے اور جلد ہی ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے ۔

خلیفہ صاحب کی علمی زندگی کی ابتدا مولانا روم کے فلسفیانہ نظام کے مطالعے سے شروع ہوئی ۔ انہوں نے جرمنی میں ڈاکٹریٹ کے لئے رومی کی ما بعدالطبیعیات لکھی جو کئی سالوں کے بعد ۱۹۳۳ میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی ۔ اس کے بعد حکمت رومی ۱۹۵۵ میں چھپی ۔ رومی کی مثنوی مطالب کے لحاظ سے ایک سمندر نا پیدا کنار ہے جس میں نایاب اور انمول موتیوں اور جواہرات کے خزانے چھپے ہوئے ہیں ۔ ان کو جس خوبی سے خلیفہ صاحب نے اپنی کتابوں میں پیش کیا وہ انہی کا حصہ تھا ۔ '' تشبیہات رومی '' بھی اسی سلسلہ کی آخری کڑی تھی جس میں انہوں نے رومی کے بنیادی تصورات کو تشبیہات کی روشنی میں بڑی خوبی سے واضح کیا ۔ اقبال نے جاوید نامہ میں مسلمانوں کی نئی نسل کے لئے رومی کی اہمیت پر بڑا زور دیا تھا ۔ ان کا مشورہ تھا کہ

پیر رومی را رفیق راہ ساز ‏ ‏ تا خدا بخشد ترا سوز و گداز

زانکہ رومی مغز را داند ز پوست ‏ ‏ پائے او محکم فتد در کوئے دوست

خلیفہ عبدالحکیم کی ان کتابوں نے ہمارے لئے اس مرد خبیر کی صحبت تک پہنچنا ممکن بنا دیا ۔

خلیفہ صاحب سر سید کے کارناموں کے بڑے مداح تھے ۔ وہ اکثر اپنی گفتگو میں سر سید کا ذکر بڑی عزت سے کیا کرتے ۔ ان کا خیال تھا کہ اس شخص کی ہمہ جہت شخصیت کی صحیح عظمت کا اعتراف ابھی تک نہیں کیا گیا ۔ سر سید نے مسلمانوں کی تاریخ کے ایک نازک دور میں انکی راہنمائی کی اور متضاد تصورات اور دوائر عمل کی الجھن سے انہیں نجات دلوائی ۔ اس نے اپنی بصیرت سے مسلمانوں کے لئے ایک ایسا واضح اور روشن راستہ متعین کیا کہ جس پر چل کر وہ اپنا دلی مقصد اور اپنی قومی خودی کو پا سکیں ۔ اس برعظیم کی سیاسی زندگی میں مسلمانوں نے بڑی ٹھوکریں کھائیں اور مایوسیوں سے دو چار ہوتے رہے لیکن جونہی قائد اعظم کی سرکردگی میں وہ پھر اسی شاہ راہ پر واپس ہوئے جس کی نشاندہی سرسید نے کی تھی تو انہیں بے مثال کامیابی حاصل ہوئی

اور اس عظیم الشان شخص کی دانائی اور بصیرت کا بھرپور احساس ہوا۔ ایک دن سرسید کا ذکر ہو رہا تھا۔ ان کے مختلف کارناموں پر تبصرہ ہوتا رہا۔ بیان کرنے لگے کہ جب سر سید نے ولیم میور کی معاندانہ کتاب پڑھی تو آگ لگ گئی اور اسی وقت محسن الملک کو خط لکھا کہ جس طرح بھی ہو کچھ رقم جمع کر کے بھیجیں تاکہ اس کتاب کا مناسب جواب لکھا جا سکے اور اس کا انگلستان میں طبع کرانے کا انتظام ہوسکے۔ اس خط میں سر سید نے بڑے والہانہ انداز میں آنحضرت کا ذکر کیا تھا۔ جب خلیفہ صاحب اس جگہ پہنچے تو ایک دم رک گئے اور آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ خلیفہ صاحب کو آنحضرت کی ذات سے جو گہری عقیدت تھی اس ایک واقعہ کے علاوہ ان کا کئی بار اظہار ہوتا رہا، تحریروں میں بھی اور گفتگو میں بھی۔

بے پناہ علم و فضلیت کے باوجود خلیفہ صاحب کی زندگی میں سادگی، عجزو انکسار اور انسانی ہمدردی کا جذبہ بہت نمایاں تھا۔ ایک دفعہ دفتر کے کچھ ملازم آپس میں کسی بات پر جھگڑ رہے تھے۔ اچانک خلیفہ صاحب آگئے۔ ایک نے دوسرے کو کہا کہ میں خلیفہ صاحب سے اس کا ذکر کرتا ہوں۔ دوسرے نے بے پروا ہی اور غصے میں کہ دیا مجھے کیا پرواہ ہے۔ خلیفہ صاحب کو کسی بات کا علم نہ تھا۔ کچھ دیر بعد ایک نوکر نے آ کر کہا کہ فلاں شخص نے آپ کے متعلق گستاخی کی ہے۔ فرمانے لگے کہ میں کیا اور میری بساط کیا! بھلے شاہ کا ایک پنجابی مصرع پڑھا کہ

بھلیا تو جیویں ککھ مسیتے

یعنی اے بھلے شاہ، تیری حیثیت تو ویسی ہے جیسے کہ چٹائی کا ایک تنکا جو مسجد میں بے شمار انسانوں کے پاؤں تلے روندا جاتا ہے۔ یہ کہ کر تمام جھگڑا ختم کر ڈالا۔ انسانی ہمدردی کا جذبہ ان کے دل میں اتنا بے پناہ تھا کہ انہوں نے کبھی کسی سائل کو نہ نہیں کہا۔ ایک دن دفتر میں آ کر بیٹھے تو ایک پوسٹ کارڈ جو ابھی ڈاک سے آیا تھا پڑھنا شروع کیا۔ پڑھتے ہی پھینک دیا اور دوسرے کام میں لگ گئے۔ کچھ دیر کے بعد گھنٹی بجائی۔ نوکر کو بلایا اور اسے حکم دیا کہ ابھی اسی وقت سو روپیہ تار کے کے ذریعے منی آرڈر فلاں پتے پر بھیج دیا جائے۔ یہ در حقیقت اسی پوسٹ کارڈ بھیجنے والے کے سوال کا جواب تھا۔ اسی طرح کے بے شمار واقعات ہیں کہ جب کسی ضرورت مند نے آپ سے مدد کی درخواست کی آپ نے بلا کم وکاست اس کی توقع سے بڑھ کر اس کی مدد کی۔ اس معاملے میں وہ کسی دنیاوی احتیاط کے قائل نہ تھے۔ ادھار مانگنے والے اکثر آیا کرتے۔ انہوں نے کم ہی کسی کو انکار کیا ہوگا اور اس معاملے میں اکثر نقصان بھی اٹھایا لیکن ان کا فلسفۂ زندگی ہی کچھ ایسا تھا جس میں روپے کی قدر و قیمت زیادہ نہ تھی۔ کہا

کرتے تھے کہ انسان محض ایک Channel (وسیلہ) ہے ، روپیہ اس طرف سے آتا ہے اور دوسری طرف چلا جاتا ہے ۔ بدقسمتی تو یہ ہے کہ بعض لوگ چاہتے ہیں کہ وہ ایک وسیع اور عریض Channel بن جائیں اگرچہ اس سے حقیقت بدل نہیں جاتی ۔

اپنے ملنے والے لوگوں سے ہمیشہ ان کا سلوک انتہائی بلند ہوتا۔ انہیں اپنے بعض ملازمین سے نقصان پہنچا تو لوگوں نے کہا کہ آپ لوگوں کے انتخاب میں غلطی کرتے ہیں ۔ کہنے لگے کہ بھئی مجھے انسان کی بنیادی نیکی پر پورا ایمان ہے۔ میں لوگوں سے اس عقیدے کی بنیاد پر معاملہ کرتا ہوں کہ وہ نیک فطرت اور دیانتدار ہیں ۔ اس سے اگر کبھی نقصان ہو جاتا ہے تو بھی میں انسان سے متعلق اپنے بنیادی عقیدے سے منحرف نہیں ہو سکتا ۔ میری نگاہ میں صرف یہی طریقہ' کار ہے جو ایک نارمل انسان کو اختیار کرنا چاہئے۔ ان کی زندگی اس بلند اصول کی ایک بہترین مثال تھی ۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی ایک بلند مقصد کے لئے وقف کر رکھی تھی اور کبھی فرو تر مقاصد انہیں اس مقصد عظیم سے منحرف نہ کر سکے ۔ عمر کی آخری منزل تک انہوں نے جس جوش اور ولولے سے اس خدمت کو انجام دیا وہ انہیں کا حصہ تھا ۔ خدا ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے ۔

All rights reserved. ©2002-2006

## جامۂ زندگی

خلیفہ عبد الحکیم

اشک بہا کے کیوں کہوں     جو ہے سو بے ثبات ہے

ذوق تغیرات میں
تازگیِ حیات ہے

جامۂ زندگی کا رنگ     تازہ بتازہ نو بنو

حسن رخ حیات ہے
عظمت کائنات ہے

لمحہ بہ لمحہ شان نو     ملتی ہے سب کو جان نو

نہ یہ فنا کی دستبرد
نہ یہ اجل کی گھات ہے

شمس و قمر ہیں جامہ زیب     اختر چرخ دلفریب

کارگہ جمال ہے
جلوہ گہ صفات ہے

نقطۂ تیز سیر ہے     بن گئے دائرے یہاں

لاکھ طرح ہوئی بیاں
اصل میں ایک بات ہے

ہوگئیں کیا نظر فروز     کثرت غم کی ظلمتیں

اتنی ہے تابش نجوم
جتنی اندھیری رات ہے

شغل مرا صنم گری     اور کبھی حرم گری

دل یہ کبھی تو کعبہ ہے
اور کبھی سومنات ہے